شیمہ رضوی اپنے افسانوں کے آئینے میں

ڈاکٹر اعظم انصاری
اسسٹنٹ پروفیسر
خواجہ معین الدین چشتی اردو ،عربی- فارسی یونیورسٹی،لکھنؤ

شیمہ رضوی ادبی،سماجی اور سیاسی حلقوں میں تعارف محتاج نہیں ہیں۔ وہ 06 /جنوری 1966 ؁ کو لکھنؤ کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئیں،جہاں ہر وقت علمی و ادبی گفتگو کے ساتھ سماجی اور سیاسی مسائل پر بحث و مباحث ہوا کرتے تھے۔ اسی ماحول میں ان کی شخصیت پروان چڑھی۔بچپن سے ہی انہیں کہانیاں سننے اور پڑھنے کا شوق و ذوق تھا۔دھیرے دھیرے کہانیاں پڑھنے میں ان کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ،بعد ازاں لکھنؤ کے لاریٹو کانوینٹ اور اعلیٰ تعلیم لکھنؤ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ان کی تخلیقی زندگی کا آغاز طالب علمی کے زمانے سے ہوتا ہے ،انہوں نے پہلے پہل لال باغ اسکول کی میگزین کے لئے ‘بے غرض محبت ’کے نام سے ؁1978 میں کہانی تخلیق کی۔اس کے بعد ا ن کی کہانیاں ملک کے مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہونے لگیں جس سے ان کے اندر خود اعتمادی اور تخلیقی پختگی پیدا ہوئی۔ وہ بہت جلدٹیلی ویژن اور آل انڈیا ریڈیو پر اردو ،ہندی نیوز ریڈر کے طور پراپنی خدمات انجام دینے لگیں۔ان کے بہترین تلفظ اور محسورکن آواز سے سامعین و ناظرین بے حد متاثر ہو جاتے تھے۔کچھ کہانیاں آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے براڈ کاسٹ ہوئیں تو اس سے ان کی شہرت اور مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ان کے متعلق ڈاکٹر شبنم اکبر اپنے مضمون ڈاکٹر شیمہ رضوی:ایک منفرد شخصیت میں رقم طراز ہیں۔

‘‘انہوں نے جس میدان میں قدم رکھازینہ بہ زینہ پروان چڑھتی رہیں اور ترقی ان کے قدم چومتی رہی۔وہ اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں ہی دور درشن پر ہندی اور اردو خبریں پڑھا کر تی تھیں۔ ان کے بہترین تلفظ و صاف وشیریں و دلکش آواز سے ناظرین و سامعین بیحد متاثر ہوتے اور ان کے اسیر بن جاتے۔اردو ،ہندی و انگریزی زبانوں کے علاوہ فارسی زبان میں بھی ان کو ملکہ حاصل تھا۔اردو ادب میں ان کی دسترس مشہور و معروف ادیبوں کے شانہ بہ شانہ تھی۔انہوں نے اردو ادب کی بہبود و ترقی کے لئے اردو کے مفاد میں نمایاں کردار ادا کیا اور اس کی ترقی کے لئے برابر کوشاں رہیں۔’’ حوالہ ۱ ۔ روشنی کا مسافر ص۔۱۸۷

اس بات کی وضاحت ان کی تحریروں سے بھی ہوتی ہے۔

''جب میں چھوٹی تھی تو مجھے کہانی سننا بہت اچھا لگتا تھا۔پڑھنا سیکھا تو کہانیاں پڑھنا میری ہابی بن گیا۔شعورسنبھالا تو کہانیاں لکھنا شروع کردیں۔یہ کہانیاں اسکول کی میگزین میں شائع ہوئیں تو حوصلہ بڑھا۔پھر آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے براڈ کاسٹ ہوئیں تو خود اعتمادی پیدا ہوئی۔اور پھر وہ وقت آیا جب میرے اندر کا کہانی کار افسانہ نگار بن گیا۔جی ہاں،اسلئے میں نے دیکھا کہ بہت تھوڑی مدت میرے قلم میں وہ جولانی پیدا ہوئی کہ پے در پے کئی افسانے وجود میں آگئے۔'' حوالہ-2 پرچھائیاں ص ۔۵

شیمہ رضوی اپنی تحریروں(کہانیاں، مضامین اور کتابوں) کے سبب ایک تخلیق کارکے طور پر اردو ادب کے قارئین کے بیچ میں خاصی شہرت و مقبولیت حاصل کر چکی تھیں تو دوسری طرف اپنے منفرد لہجہ اور شیریں آواز کی وجہ سے ٹیلی ویژن اور آل انڈیا ریڈیو (اردو اور ہندی نیوز ریڈر کے طور پر) کے سامعین وناظرین کے بیچ انتہائی محبوب و مقبول ہو چکی تھیں۔ 1991 میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پہلی خاتون لکچرر مقرر ہوئیں اور بعد میں شعبہ اردو کے ہیڈ کی ذمہ داریوں کو بحسن خوبی انجام دیا۔اس دوران انہوں نے یونیورسٹی کے اکیڈمی کے ساتھ ہی ساتھ ایڈمنسٹریٹو عہدوں کی اضافی ذمہ داریوں کو سنبھالا ۔وہ مئی 1997 میں اترپردیش اردو اکادمی کی چیئر پرسن مقرر ہوئیں اور تقریباً ڈھائی سال تک اس عہدے پر فائز رہیں۔اس دوران انہوں نے اترپردیش اردو اکادمی میں سلور جبلی کے موقع پر کئی ایک پروگرام آرگنائز کرائے جیسے'' کل ہند مشاعرہ شاعرات ''گاندھی بھون لکھنؤ،''کل ہند مشاعرہ'' رویندرالیہ لکھنؤ(جس کا افتتاح وزیر اعلیٰ اترپردیش محترمہ مایاوتی نے اور مہمان خصوصی کے طور سابق وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی نے شرکت کی تھی اور اپنا کلام بھی سنایا تھا) ، ''غالب کے نام ایک شام''،''حسرت موہانی کے نام ایک شام''،''جشن لکھنؤ''بیگم حضرت محل پارک لکھنؤ،''شام افسانہ'' اردو اکاڈمی آڈیٹوریم گومتی نگر لکھنؤ اور سیمینار بعنوان ''اردو میں دلت سماج''اس سیمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت جسٹس حیدر عباس رضا نے اور دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر فضل امام رضوی نے فرمائی۔یہ اتر پردیش میں اپنی نوعیت کا پہلا سیمینار تھاجو اتر پردیش اردو اکادمی میں منعقد کیا گیا تھا۔اس سیمینار میں پڑھے گئے مقالے اردو اکادمی کے دو ماہی رسالہ ''اکادمی' کے شمارہ نمبر-1، جولائی ۔اگست 2000 ؁ء او ر شمارہ نمبر-3،مئی ۔جون 2001 ؁ء میں شائع ہوئے ۔ تین بار اترپردیش سرکار میں وزیر رہیں۔ پہلی مرتبہ 1999 میں اپنے والد کے انتقال کے بعد خالی ہوئی ودھان سبھا کی سیٹ پربھاچپا کی طرف سے وہ ایم ایل سی منتخب ہوئیں اور سوشل ویلفئیر منسٹر بنیں،دوسری مرتبہ میڈیکل ایجوکیشن منسٹر اور تیسری مرتبہ انفارمیشن ٹکنالوجی اینڈ الکٹرانک منسٹر بنی تھیں۔علاوہ ازیں اس پارٹی کے مختلف عہدوں پر رہ کر اپنی خدمات انجام دیتی رہیں۔اس

دوران انہوں نے پارلیا منٹری اسٹڈی گروپ کے ساتھ اٹلی، آسٹریلیا، چین، جاپان،انگلینڈ،امریکہ جیسے ممالک کا سفر کیا، وہاں کامیاب لکچر بھی دیئے اوراپنے ملک و علاقہ کا نام روشن کیا۔ قانون ساز کونسل کی کاروائی کے دوران ہی برین ہیمرج ہوگیااو ر انہوں نے 19 اگست2009 کو اس دنیا کو الوداع کہہ دیا۔

تخلیق کار سماج کا بہت ہی حساس فرد ہوتا ہے۔وہ جس سماج میں رہتا ہے اس کے اطراف و اکناف سے وہ اثرات بھی قبول کرتا ہے،اسی کو اپنی کہانی کا موضوع بناتا ہے، اس کو الفاظ کے رنگ برنگ پھولوں سے سجا تا ہے، خوبصورت تشبیہات و استعارات سے مینا کاری کر کے اسے اپنے خیالات و نظریات سے مزین کر کے اس کو صفحہ قرطاس پر بکھیر کر اپنے قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔شیمہ رضوی نے سماج میں اپنے اطراف و اکناف جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اس کا گہرائی سے مطالعہ و مشاہدہ کیا،اسی سے اپنی کہانی کا مواد اکٹھا کیا اور اپنی کہانیوں میں بیان کیا ہے۔اس سلسلے میں ان کا افسانہ ‘سمجھے نا ہم تو ’ اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔اقتباس دیکھئے۔

‘‘آج چھٹی کا دن تھااور یہ چھٹی کا دن چھ دن سے پہلے ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔موسم بھی خوشگوار تھا اور طبیعت بھی موزوں تھی لہٰذا میں اس موقع سے پورا فائدہ اٹھالینا چاہتی تھی لیکن کس موضوع پر لکھا جائے افسانہ؟میرا ذہن ابھی کسی پلاٹ کی ترتیب ہی دے رہا تھا کہ اچانک اڑا ڑادھم کی آواز سے میرے حسین خیالات ایک دم بکھر گئے اور میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔الماری میں رکھے سارے سامان رسالے،میگزین ایک ایک کر کے زمین پر بکھر چکے تھے۔اور فیضی میاں ان میں سے جلدی جلدی اپنے مطلب کے رسالے نکال نکال کر صوفہ پر اچھالتے جا رہے تھے۔۔۔‘‘اف’’!میں سر تھام کے بیٹھ گئی ۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں ایک دم اچھل پڑی ۔مل گیا ۔مل گیا۔ میرے افسانے کا موضوع مل گیا۔ہاں میرے افسانے کا موضوع تو خود چل کر میرے پاس آیا تھا اور کتنی دیر سے میرے ارد گرد چکر لگا رہا تھا۔کیسی ننھی ننھی شرارتیں کر رہا تھا۔میں سوچنے لگی ۔ہم ہی اپنے گرد وپیش سے غافل رہتے ہیں ورنہ موضوعات تو بکھرے پڑے ہیں۔ سمجھے نا ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا۔’’ حوالہ ۳ پرچھائیاں ص۔ ۶۹۔۷۴

شیمہ رضوی کی کہانیوں میں عصری مسائل کا بیان بہت ہی غمگین پیرائے میں ملتا ہے اور غور و فکر کا احساس بھی دلاتا ہے جس سے آپ اور ہم برابر دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ان کے بیشتر افسانوں میں متوسط طبقہ کی عورتوں کا ذکر ملتا ہے ،جسے مرد اساس سماج کے ذریعہ عورتوں کو جبر و استبداد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔انہوں نے عورتوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے غیر مساویانہ سلوک و نا انصافی کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ ہندوستانی سماج کو آئینہ دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس سلسلے میں ان کا افسانہ ''پاگل'' کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ آج بھی ہندوستانی سماج میں لڑکیوں کو پیدا ہونے سے پہلے ہی ماں کی کوکھ میں یا پیدا ہونے کے بعد مار دیا جاتا ہے ۔یہ ہندوستانی سماج کا کوڑھ ہے جس کا خاتمہ ضروری ہے ۔اس افسانے کا کردار فرید کو جب پتہ چلتا ہے کہ اس کی بیوی شیلو نے ایک بچی کو جنم دیا ہے تو وہ دماغی توازن کھو دیتا ہے اور جنونی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔وہ جس طرح کے غیر انسانی سلوک کامظاہرہ کرتا اس سے انسانیت شرمندہ ہو جاتی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو۔

" فرید نے مارے غصہ میں اپنے بال نوچ لئے۔لڑکی۔اونہہ۔پانچ سال بعد پیدا بھی کر سکی تو لڑکی۔لعنت ہے ایسی عورت پر۔

اور وہ بجائے بلڈ بینک جانے کے سیدھا بار میں گھس گیا۔۔۔

اوہ تم اب آئے ہو مین۔!ڈاکٹر بولی۔''دو گھنٹہ بعد"

"میں بہت جلدی آیا ہوں۔یہ لو۔یہ بوتل۔۔۔بوتل منگائی تھی نا آپ نے"

اس نے ڈاکٹر کی طرف شراب کی بوتل بڑھاتے ہوئے کہا۔''چڑھا دیجئے اس کمبخت کو۔"

وہ بھی کیا یاد کرے گی سالی۔لڑکی پیدا کی۔پانچ سال بعد۔۔۔وہ بھی لڑکی۔

ڈاکٹر سب سمجھ چکی تھی۔۔۔لیکن مین۔۔۔اسے اب کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

وہ رہا سامنے اسٹریچر پر اس کا بے جان جسم۔ڈاکٹر نے دائیں طرف اشارہ کیا۔اس نے گھوم کر دیکھا۔تو وہ مر گئی تھی۔

چلو اچھا ہوا ، بہت اچھا ہوا۔۔۔

مجھے اس سے نجا ت ملی۔اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے واپس ہو نے کے لئے مڑا۔

تم جا رہا ہے مین۔ڈاکٹر بولی۔

ہاں۔۔۔اور لاش؟

اسے مردہ کھانے بھجوادو۔۔۔اور بچی

اسے یتیم خانے بھجوا دویا اسی کے ساتھ دفن کردو۔'' حوالہ ۴ - پرچھائیاں، ص۵۳۔۵۴

اسی طرح سے ان کا بہت ہی اہم افسانہ 'سراب' ہے جس میں والدین دولت اور نام و نمود کے لالچ میں آکر اپنی لڑکیوں کی شادی اوباش و مکار یا پکی عمر کے مرد سے کر دیتے ہیں کہ وہ عیش و آرام کی زندگی گذاریں گی مگر یہاں پر نو بیاہتا کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے اور وہ طرح طرح کی ذہنی و نفسیاتی الجھنوں میں گرفتار ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ان عورتوں کو غلط کاموں میں ملوث کرکے ان کے ذریعہ غیر قانونی کام کرائے جاتے ہیں جس کے لئے وہ ذہنی و نفسیاتی طور پر تیار نہیں ہوتی ہے۔ان کے والدین کو بھی نہ تو اپنی عزت ووقارکی فکر ہوتی ہے اور نہ ہی سماج کا ڈر و خوف ۔وہ دن بہ دن برائی کے دلدل میں پھنستی چلی جاتی ہیں۔انہوں نے اس افسانے کا مرکزی کردار' ورشا' کے ذریعہ دولت اور نئی تہذیب پر تنقید کے نشتر چلائے ہیں اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ لوگ مغربی تہذیب کی چکا چوندھ بھری زندگی کے چکر میں پھنس کر اپنے افراد خانہ کو اس کی مرضی کے خلاف دلدل میں جبراً ڈھکیل دیتے ہیں ۔ورشا کے والد گوپال ایک اخبار میں شائع میٹریمونیل کے ذریعہ اپنی اکلوتی بیٹی کا رشتہ ہند نژاد امریکی راکیش کے ساتھ طے کر دیتے ہیں کیونکہ اسے جہیز کی چاہت نہیں ہے۔راکیش کی چاہت صرف اتنی ہے کہ اس کی ہونے والی بیوی کانونٹ (انگلش میڈیم)کی پڑھی ہوئی ہو۔راکیش سے شادی کے بعد ورشا امریکہ چلی جاتی ہے اورنہ چاہتے ہوئے بھی نشیلی اشیاء کی اسمنگلنگ میں ملوث ہو جاتی ہے۔اس افسانے میں گوپال بابو نے اپنی بیٹی کے لئے جس عیش و آرام بھری زندگی کے سپنے دیکھے تھے ،یہاں اپنے آدرشوں کا جنازہ نکلتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔شیمہ رضوی نے بہت ہی خوبصورت پیرائے میں اس کا نقشہ کھینچا ہے۔

"اندرا گاندھی انٹر نیشنل ایرپورٹ پر پین ایم نے لینڈ کیا۔شیشہ کی دیوار سے سر لگائے ہوئے بڑی بے قراری سے گوپال بابو کی نگاہیں سامنے آتے ہوئے مسافروں میں اپنی ورشا کو تلاش کر رہی تھیں۔اچانک انہیں اپنے کاندھے پر کسی جانے پہچانے ہاتھ کا احساس ہوا وہ پیچھے گھومے۔بکھرے ہوئے بے ترتیب بالوں کی ایک ہیپی نما لڑکی ہاف پینٹ اور باریک بائیلان کی ایسی سلیولیس قمیض پہنے ہوئے تھی جس سے اس کا جسم جھانک رہا تھا لاپرواہی سے کاندھے پر ایک چھوٹا سا ایر بیگ ٹانگے ویران آنکھوں سے اسے گھور رہی تھی۔ آنکھیں چار ہوتے ہی اپنی انگلی میں دبا ہوا سگرٹ جلدی سے زمین پر پھینک کر،اسنیکرز شو سے مسلتے ہوئے چرس زدہ پیلے پیلے دانت نکال کر زبردستی مسکراتے ہوئے بولی:آخر کو نہیں پہچان سکے نا مجھے۔! شراب کا ایک تیز بھپکا آیا۔باپو ۔تم نے سوچا تھا تمہاری ورشا امریکہ جاکر بڑی سکھی رہے گی۔پر یہ نہیں سوچا کہ جب اس کا

شوہرزبردستی شراب کا جام پیش کرے گا تو وہ انکار کر کے کہاں رہ سکے گی۔؟جب وہ کلب میں غیر مردوں کے ساتھ ڈانس کر نے پر مجبور کی جائے گی تو اس کے ضمیر کی چیخوں کو کون سنے گا۔؟اور۔جب اسے اسمنگلنگ کے لئے جگہ جگہ بھیج کر استعمال کیا جائے گا تو اسے اپنی زندگی رسک پر لگانا ہی پڑے گا۔باپو تمہارے آدرشوں کی ارتھی نکل چکی ہے۔تمہاری ورشا نئی تہذیب کی بھینٹ چڑھ چکی ہے۔'' حوالہ ۵ ۔ پرچھائیاں ص ۱۱۱۔۱۱۲

اسی طرح سے ان کے دوسرے افسانوں میں'بکھرے سپنے'،'اپنا پرایا'،'بے غرض محبت' وغیرہ میں عورتوں کے مسائل کو بہت ہی خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔شیمہ رضوی نے افسانچہ' اپنا پرایا 'میں خون کے رشتے اور اس کی اہمیت کو بڑے ہی دل سوز انداز میں پیش کیا ہے اور اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آج کے دور کا انسان کتنا عیار ومکار اور بے حس ہو گیا ہے ۔انہوں نے ماں جائی اور سوتیلی کے رشتے کے فرق کوواضح کرتے ہوئے اس بات کو بڑے ہی حقیقت پسندانہ انداز اورآسان تحریروں کے ذریعہ اس بات کوعام قاری تک پہنچانے کی کامیاب سعی کی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو۔

"اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں ایک عورت دو سال کے بچے کو گود میں لئے پاگلوں کی طرح تیزی سے داخل ہوئی اور بچے کا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بے قراری سے بولی۔ڈاکٹر صاحب،ڈاکٹر صاحب یہ دیکھئے اس بچے نے کھلا ریزر پکڑلیا ، پتہ نہیں اس کی انگلی کی کون سی رگ کٹ گئی کہ خون بند ہونے کا نام نہیں لیتا۔ڈاکٹر صاحب کچھ کیجئے،پلیزاس بچے کی انگلی کو کچھ ہو گیا تو میں زہر کھالوں گی۔۔ ۔ ایک ہفتہ کے بعد اسی اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں وہی عورت خون میں لت پتھ نیم بیہوش سے ایک نوجوان لڑکے کے ساتھ انتہائی اطمینان سے داخل ہوئی۔لڑکے کے داہنے بازو سے خون فوارے کی طرح بہہ رہا تھا'کیا ہوا اسے۔ڈاکٹر بولا''۔جی ایکسیڈنٹ۔

عورت کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ارے یہ تو فریکچر کیس ہے،کمپاؤنڈر فریکچر۔شاید ہاتھ کاٹنا پڑے۔ ڈاکٹربولا۔

تو کاٹ دیجئے۔عورت بے پروائی سے بولی۔

وہ اپنے خون کی تڑپ تھی۔یہ پرائے خون کی آواز ۔'' حوالہ ۶ ۔ پرچھائیاں ص۹۴۔۹۵

انہوں نے اپنے افسانوں میں صرف عورتوں کے مسائل و مصائب کو اپنا موضوع نہیں بنایا ہے ،بلکہ عصری مسائل پر بھی انہوں نے افسانے تخلیق کئے ہیں۔انہوں نے

ہندوستانی سماج اور سیاست کا سب سے بڑا چیلنج بنے تنازعہ بابری مسجد۔رام جنم بھومی کے حوالے سے بھی ایک افسانہ تخلیق کیا ہے جس کا نام' معصومیت' ہے۔اس افسانے میں بچوں کے ذریعہ بابری مسجد اور رام جنم بھومی کا کھیل کھیلا جاتا ہے، جس میں کرفیو لگنے اور اذان اورشنکھ کی آواز کو لیکر بچے ایک دوسرے کو مارنے و مرنے کے لئے اتاولے دکھائی دیتے ہیں۔ مندر۔مسجد کا معاملہ ہندوستانی سیاست کا ایک ایسامرض ہے جو ناسور بن گیا ہے اور یہ دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے۔آج کل یہ ہندوستانی سیاست کا سوپان تو حصول اقتدار کا زینہ بن گیا ہے۔یہ ایسا مرض ہے جس کی زد میں دونوں مذاہب کے مانے والے ہیں اور اس کا برابر شکار ہو رہے ہیں۔ ہندوستانی سماج و سیاست میں مندر۔مسجد کے نام پر تہذیب آدم اور نسل آدم کا شکار کیا جا رہا ہے جس سے انسانیت مجروح ہو رہی ہے اور ہندوستانیت کراہ رہی ہے۔ یہاں پر مشہور ترقی پسند شاعر ساحرؔ لدھیانوی کی نظم' اے شریف انسانوں!'کے بول دماغ میں گھومنے لگتے ہیں۔

خون اپنا ہو یا پرایا ہو۔نسل آدم کا خون ہے آخر

یہاں افسانہ معصومیت کا اقتباس پیش خدمت ہے۔

"میری آواز سنتے ہی دونوں اچک کر الگ کھڑے ہو گئے۔

یہ مجھے اذان نہیں دینے دیتا،عرفی نے شرفی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی شکایت کی۔

یہ مجھے شنکھ نہیں بجانے دیتا،شرفی نے صفائی پیش کی۔

"اذان'' ،''شنکھ'' ابھی یہ گتھی میں سلجھانے بھی نہ پائی تھی کہ میری نظریں کمرے میں ڈھیر لگی اینٹوں پر پڑیں۔

یہ کیا گندگی پھیلا رکھی ہے تم لوگوں نے،یہ اینٹیں کیوں اکٹھا کر رکھی ہیں۔

"یہ اینٹیں نہیں ۔بابری مسجد ہے''۔عرفی بولے۔

"نہیں ۔رام جنم بھومی ہے،شرفی نے اکڑ کر کہا''۔ حوالہ ۷ پرچھائیاں ص ۱۰۰

اگر بحیثیت افسانہ نگار بات کی جائے تو انہوں نے کل اکیس افسانے تخلیق کئے ہیں جن میں گیارہ افسانے اور دس افسانچے کے زمرے میں آتے ہیں۔انہوں نے اپنے ان افسانچوں کو منی کیپسول سے تعبیر کیا ہے۔ان کے افسانوں کا مجموعہ 'پرچھائیاں' کے نام سے 1991ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا ہے۔اگر ان کے افسانوں کے اسلوب یا زبان و بیان کی بات کی جائے تو انہوں نے اپنی بات تو بہت ہی پر

کشش اور دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔انہوں نے جو مکالماتی انداز بیان اختیار کیا ہے اس میں بہت زیادہ جاذبیت ہے جس کا ذکر پچھلے اقتباسات میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کے افسانے فن کی کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں۔ان کے افسانوں کی خاص بات یہ ہے کہ ان کے افسانے یا افسانچے کا اختتام المیہ پر ہوتا ہے۔ارسطو نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔اس سلسلے میں وہ خود ر قم طراز ہیں۔

"میرا تجربہ ہے کہ کوئی شعر یا افسانہ اگر بے ساختہ تخلیق ہو جائے تو یہ بات صد در صد درست ہے کہ کوئی بات آپ کے دل کے کسی گوشے کو بڑی شدت سے چھوکر گذر گئی ہے۔میرے یہ افسانے بھی ماہ و سال کی حقیقتوں کے بے ساختہ نقیب ہیں۔ حقیقتیں اکثر بڑی تلخ ہوا کرتی ہیں شاید اسی تلخی کا اثر ہے کہ میرے افسانوں میں نشاطیہ پہلو عموماً مفقود ہیں۔لیکن میں اسے افسانے کے لئے فال نیک سمجھتی ہوں، اس لئے کہ المیہ یا ٹریجڈی کا اثر نشاطیہ یا کامیڈی سے بہر حال دیر پا ہوتا ہے۔"

کتابیات

حوالہ ۱۔ روشنی کا مسافر۔پروفیسر آصفہ زمانی ، پلس میڈیا اشوکا مارگ،حضرت گنج لکھنؤ، سنہ ۲۰۱۰ء ص۔۱۸۷

حوالہ ۲۔پرچھائیاں ۔شیمہ رضوی،نامی پریس لکھنؤ ، سنہ ۱۹۹۱ ء ص ۔۵

حوالہ ۳ ۔ پرچھائیاں ۔شیمہ رضوی،نامی پریس لکھنؤ ، سنہ ۱۹۹۱ ء ص۔ ۶۹۔۷۴

حوالہ ۴ ۔ پرچھائیاں ۔شیمہ رضوی،نامی پریس لکھنؤ ، سنہ ۱۹۹۱ ء ص ۔۵۳۔۵۴

حوالہ ۵ ۔ پرچھائیاں ۔شیمہ رضوی،نامی پریس لکھنؤ ، سنہ ۱۹۹۱ ء ص۔۱۱۱۔۱۱۲

حوالہ ۶ ۔ پرچھائیاں ۔شیمہ رضوی،نامی پریس لکھنؤ ، سنہ ۱۹۹۱ ء ص۔۹۴۔۹۵

حوالہ ۷ ۔ پرچھائیاں ۔شیمہ رضوی،نامی پریس لکھنؤ ، سنہ ۱۹۹۱ ء ص ۔۱۰۰

حوالہ ۸ ۔ اکادمی دو ماہی رسالہ لکھنؤ،شمارہ۱،جولائی ۔اگست سنہ ۲۰۰۰ء

حوالہ ۹۔اکادمی دو ماہی رسالہ لکھنؤ،شمارہ۳، مئی۔جون سنہ ۲۰۰۱ء